یادوں کے بجھے ہوئے سویرے!

مولانا محمد بلال بربری
استاذ جامعہ

اچھی طرح یاد ہے، اور وہ پر لطف منظر اب بھی، جب کہ میں یہ تحریر قلمبند کرنے لگا ہوں، میرے دماغ کے پردے پر ایک محفوظ انمٹ فلم کی مانند چل رہا ہے، درجہ سادسہ کا سال ہے، اور جلالین شریف کا درس جاری ہے، سورۂ نساء کی آیت میراث کی تفسیر شروع ہوئی، فن میراث کی پیچیدگیوں اور فن میراث پر دسترس کے حصول میں مشکلات کے متعلق دوران گفتگو میں یہ بات کان میں پڑتی ہے: ''ہمارے جامعہ کے دارالافتا میں بھی ہمارے ایک مفتی صاحب کو فن میراث میں وہ کمال حاصل ہے کہ اگر کوئی نیند میں بھی ان سے میراث کا کوئی مسئلہ دریافت کرلے تو وہ اس کو بالکل ٹھیک ٹھیک بتادیں گے، اور وہ مفتی صالح محمد صاحب کاروڑی ہیں''۔ یہ وہ سب سے پہلا موقعہ تھا جب حضرت استاذ مفتی صالح محمد کاروڑی شہیدؒ کے تذکرۂ خیر میں یہ کلمات' ایک ایسی شخصیت کی زبان سے سنے جو اپنی گفتگو میں الفاظ کے انتخاب اور ان کی ادائیگی کے بارے میں انتہائی محتاط واقع ہوئی ہے، اور درحقیقت اس وقت یہ کلمات سن کر اَن سنے کر دیئے، البتہ دورۂ حدیث کے اختتام تک میراث کے مسائل حل کرتے وقت ان کلمات کی صدائے باز گشت دماغ کے کسی گوشے میں ضرور سنائی دیتی رہی۔

۲۰۰۹ء میں جب میرا تخصص فی الفقہ میں داخلہ ہوا اور دارالافتا سے باقاعدہ اور مسلسل ربط کا سلسلہ شروع ہوا، تو چونکہ تخصص سال اول وسال دوم کے طلبہ کی درسگاہ ایک ہی تھی، تب تخصص سال دوم کے طلبہ ساتھیوں کے ذریعے حضرت استاذ مفتی صالح محمد کاروڑی شہیدؒ کے متعلق جو منتشر طور پر سماعی تعارف ہوا، اس کے متفقہ نکات یہ تھے کہ: ''مفتی صالح صاحب بہت ہی سخت ہیں''، ''استفتاء کی تاریخ واپسی سے ایک دن یا دو دن پہلے ہی اگر فتوی ان کی جگہ پر تصحیح کے لئے نہ پہنچے تو خیر نہیں ہے''، ''جب دارالافتاء میں ''چھوٹے'' کی صدا گونجے تو پکارنے والے مفتی صالح صاحبؒ ہیں، جو بلا قید عمر ہر ایک کو ''چھوٹے'' کہہ کر بلاتے ہیں''، ''مفتی صالح صاحب کی تصحیح کی باری میں فتویٰ انتہائی مختصر اور ''ٹو دی پوائنٹ'' ہونا چاہئے، تفصیلات سے مکمل گریز''، ''اگر کسی تحریر میں کوئی غلطی محسوس ہوتی ہو، یا مثلاً تاریخ واپسی کے بعد ان کی جگہ پر رکھا جانا ہو تو وہ فتوی مفتی صاحبؒ کی جگہ پر ان کے سامنے نہ رکھا جائے، بلکہ یا ان کے آنے سے پہلے یا ان کے جانے کے بعد رکھا

جائے، مبادا ان کی نظر کسی غلطی یا کوتاہی پر پڑ جائے اور پھر وہ سب کچھ ہو جس کو ساتھی اپنی یادداشت میں لکھ کر اپنے ’’میڈیا‘‘ کے ذریعے پھیلا دیں‘‘، ’’اگر فتوے میں کوئی گڑ بڑ ہو تو مفتی صاحبؒ بہت اچھے ’’ناشتے‘‘، یا ’’دوپہر کے عمدہ کھانے‘‘، یا ’’شام کی دودھ پتی چائے‘‘ سے تواضع کرتے ہیں‘‘، یعنی اگر صبح کے وقت استاذ محترمؒ کسی طالب علم ساتھی کو کسی غلطی پر تنبیہ کے لئے بلاتے تو یہ اس کے لئے ’’دن کا میٹھا آغاز‘‘ اور ’’صبح کا بہترین ’’ناشتہ‘‘، دوپہر کے وقت یہ طلبی ہوتی تو ’’دوپہر کا لذیذ کھانا‘‘، اور اگر کسی کی ایسی ہی ’’قسمت‘‘ شام کے وقت ’’یاوری‘‘ کرتی تو یہ اس کے لئے ’’دودھ پتی چائے کے کپ‘‘ کی نوید ہوتی، بلکہ ان اصطلاحات کا دائرہ تو تمام اساتذۂ کرام کی ’’تواضعات‘‘ کو جامع وشامل تھا۔

ظاہر سی بات ہے کہ ’’لاء اینڈ آرڈر‘‘ کی اتنی کشیدہ صورتحال، اور ’’کورٹ مارشل‘‘ کے اتنے سخت اصولوں کو سن کر بہ استثنائے چند جو سب کی حالت ہوتی تھی، وہی میری حالت تھی، نتیجہ یہی ہوا کہ جب سال دوم والے ساتھیوں کا قافلۂ علم کوچ کر گیا اور تمرین افتا کی وادی میں ہمارے سال کے ساتھیوں نے قدم رکھا تو مفتی صاحبؒ کا یہی تأثر سب کے دماغوں پر مسلط تھا اور جو اصول وقواعد سال گزشتہ کے ساتھیوں سے سن رکھے تھے، اور ہم تک وہ بطور وراثت منتقل ہوئے تھے، انہی کی مکمل پاسداری کی گئی، حتی کہ صبح کے ناشتے، دوپہر کے کھانے اور شام کی چائے تک کی اصطلاحات تک میں کسی قسم کی ترمیم کو گوارا نہیں کیا گیا۔ تخصص فی الفقہ سے فراغت تک میرا حال یہ تھا کہ میں بلاوجہ شدید استاذ محترمؒ کے سامنے جانے کی کبھی بھی جرأت نہیں کر سکا، حتیٰ کہ جب راستے سے گزرتے، ٹکراؤ ہو جاتا تو ہمارے مدارس کے عام رواج کے موافق راستہ چھوڑ کر ایک جانب کھڑا ہو جاتا لیکن سلام کے الفاظ منہ کے اندر ہی رہ جاتے، ان الفاظ کے باہر لانے کی قوت نہیں پاتا تھا۔

لیکن تخصص فی الفقہ مکمل کر لینے کے بعد میری انتہائی خوش قسمتی سے جب حضرت استاذؒ سے گھل ملنے کا موقعہ میسر آ ہی گیا، تب آپؒ کی مرنجاں مرنج طبیعت، آپ کا ذوق ظرافت، طلبہ سے آپؒ کا پر خلوص اور بے لوث و بے غرض قلبی تعلق اور آپؒ کی اس ظاہری سختی کے پردے کی اوٹ سے ایک انتہائی نرم خو اور نرم دل انسان آشکارا ہوا۔ اس انکشاف نے وہ تمام کدورتیں اور دوریوں کی پرچھائیاں جو بشری اور فطری کمزوریوں کی بنا پر دل پر چھائی ہوئی تھیں، یکدم و یکسر صاف کر کے دل کو قلعی کر دیا، اور آپؒ کی محبت دل میں جاگزیں، بلکہ پیوست ہو گئی۔

نحیف البدن، میانہ قامت، سخت جانی وسخت کوشی کی واضح علامات لیا ہوا گندمی رنگ، آنکھوں پر عینک، اور اس عینک کو نیچے کی جانب رکھ کر اوپر سے دیکھنے کا ایک مخصوص انداز، سیدھا سادا لباس جس میں پر تکلف مفتیانہ جاہ وجلال کی کوئی شان جھلکتی نظر نہ آتی تھی، سر پر جالی والی ٹوپی، جو ایک خاص وضع کے ساتھ ہر وقت سر پر رہتی تھی، انداز گفتگو میں مادری زبان پشتو کے محسوس ہوتے اثرات، لیکن اردو الفاظ کے استعمال میں کسی قسم کی شکستگی یا جھول سے مبرا، چلتے وقت سینہ کشادہ، کندھے اچکے ہوئے، کبھی جھکتی، کبھی اٹھتی نظریں، لیکن راہ گزرتے ہوئے نہ کوئی گھن گرج ہوا کرتی اور نہ ہٹو بچو کا شور۔

دوپہر کے کھانے کے وقفے میں سال گزشتہ تک میرا معمول تھا کہ میں دارالافتاء میں اپنے کچھ اساتذہ اور دیرینہ احباب کے ساتھ دسترخوان پر کھانے میں شریک ہوا کرتا تھا، میرے لئے یہی وہ حسین لمحات ہوا کرتے تھے جب آپؒ کے ساتھ خوب کھل کر گفتگو ہوتی اور آپؒ سے مختلف قسم کی علمی باتیں، سیاسی نکات، ادبی ظرائف، تاریخی سلسلے، اور مزید برآں ''خوش گپیاں''، اور ''چھیڑ چھاڑ'' سننے کو ملتیں۔ کبھی مولانا شمس الحق افغانیؒ کے علمی شہ پارے، کبھی تقسیم ہندو پاک اور دوقومی نظریے کے سیاسی اثرات، کبھی مولانا اعزاز علیؒ کی ''نفحة العرب'' وغیرہ سے کشید کئے ہوئے ادبی قصے، کبھی افغانیوں، پشتونوں، بلوچیوں، میمنوں اور گجراتیوں کے تاریخی پس منظر اور پیش منظر۔ تخصص فی الفقہ کے دورانیے میں آپؒ کی شخصیت کا جو عکس لوحِ دل پر ثبت تھا، اس کی بنا پر میرے لئے آپؒ کی شخصیت کے اس پر لطف اور دلنشیں رخ کا انکشاف ایک اچھنبا تھا، جلد ہی آپؒ کے سامنے مجھے بھی ''جرأت گفتار'' ہو ہی گئی، جس کا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور پھر آپؒ کے ساتھ محفل کا رنگ، استاذ اور شاگرد کی محفل کی بجائے، گہرے مونس و رفیق کی محفل کا سا معلوم ہونے لگا: ع

بہت لگتا ہے جی ان کی صحبت میں

حال ہی میں مولانا شمس الحق افغانیؒ کے جملہ افادات، تالیفات و رسائل اور ملفوظات، ایک عمدہ مجموعے کی صورت میں شائع ہوئے ہیں، اس مجموعے کے بازار میں آنے کے کچھ ہی دن بعد آپؒ نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ ''میں نے اس مجموعے کا مکمل سیٹ خرید لیا ہے''، اسی طرح اس مجموعے میں موجود مولانا شمس الحق افغانیؒ کے دروس تفسیر کی خوب تعریف فرمائی، اور اس کے بعد گاہے گاہے مولانا شمس الحق افغانیؒ کی تحقیقات سنا کر طبیعت شاد فرماتے رہتے تھے۔ جس انداز کے ساتھ آپؒ یہ تحقیقات بالاستیعاب سنایا کرتے تھے، اس سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ آپؒ غیر معمولی حد تک مولانا افغانیؒ کی شخصیت سے متأثر تھے اور معقولات میں کسی صاحب علم کو ان کے پائے کا تسلیم نہیں فرماتے تھے۔ اگرچہ مولانا شمس الحق افغانیؒ کی علمی شخصیت اور معقولات پر مولانا افغانیؒ کی دسترس ویسے ہی روز روشن کی طرح آشکارا ہے، لیکن آپؒ سے متعدد بار مولانا افغانیؒ کی تعریف وتوصیف سن کر اس مجموعے سے استفادے کا طبعی رجحان دوچند ہو گیا۔

برصغیر کی سیاسیات کے باب میں ''مدنی الطبع'' تھے، اور حضرت مدنیؒ کی سیاسی بصیرت کے بے حد مداح تھے۔ تقسیم ہندو پاک کے متعلق اپنے اختیار کردہ نکتۂ نظر کے بارے میں انتہائی منشرح الصدر تھے، اور اس بارے میں اس کے مخالف کسی رائے کو تسلیم کرنے سے یکسر بیزار تھے۔ ایک صاحب نے جو آپؒ سے بہت زیادہ بے تکلف تھے، ایک موقع پر اپنے کسی سیاسی نکتۂ نظر کی جو آپؒ کے سیاسی موقف کے برخلاف تھا، وکالت کرتے ہوئے جب یہ کہا کہ ''میرے اختیار کردہ اس سیاسی نظریے کی فقہی بنیادیں مضبوط ہیں، البتہ یہ سیاسی نظریہ معروضی صورت حال میں نتیجہ خیز اس وجہ سے ثابت نہ ہوسکا کہ اس نظریے کو اپنی وکالت

کے لئے درست اور ایمان دار لوگ نہ مل سکے'' اس واقعے کے بعد جب بھی آپؒ کی ان صاحب سے ملاقات کی صورت ہوتی تو بڑے مزے لے لے کر ان صاحب کے اس جملے پر کہ ''لوگ صحیح نہیں ملے'' ان کو چھیڑا کرتے تھے، اور آپؒ کا یہ انداز مزاح تمام حاضرین مجلس کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیر دیتا۔

قوم افغان آپؒ کی دلچسپی کا خصوصی مرکز تھی، جا بجا ان کی غیرت، ان کی ہمت، اور ان کی شجاعت کو داد تحسین سے نوازتے اور تاریخی واقعات سے اپنی بات کو مدلل کر کے بیان کرتے، نیز وہاں کی مختلف شخصیات کے تعارف اور ان کی مدحت میں رطب اللسان رہتے، اور اپنی بات کو اتنی قوت اور جوش کے ساتھ پیش کرتے کہ سامعین کو واقعی اپنا ہم نوا بنا لیتے۔ اسی مدح سرائی سے جب آپؒ دیگر اقوام کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے قوم افغان کے خصائل وشمائل کو دیگر اقوام کے خصائل وشمائل کے بالمقابل شمار کرتے تو آپؒ مفتی سے مؤرخ نظر آنے لگتے۔ ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ آپؒ کی نشست پر موجود کتابوں میں مستقل موجود رہتی تھی، جو آپؒ کے اس قوم افغان اور ان کے خطۂ ارضی سے آپؒ کی محبت کی علامت تھی۔ محمد بن قاسمؒ کے سندھ میں داخلے کی کیا صورت بنی؟ سندھ میں بیرون سندھ سے آنے والی قوموں کے آبسنے کا سبب اور محرک کیا ہوا؟ تقسیم برصغیر سے کس کو کیا فائدہ ہوا اور کس کو کیا نقصان؟ گجراتیوں اور میمنوں کی تاریخی وابستگی اور ان کے نمایاں اوصاف وخصوصیات کیا ہیں؟ وغیرہ وہ سوالات تھے جن کے جوابات آپؒ خوب جی کھول کر مزے مزے سے دیتے۔ اس وقت میں دوران گفتگو آپؒ کے انداز کو چشم تصور میں واضح طور پر دیکھ رہا ہوں اور آپؒ کے سادہ اور مخصوص تکیۂ کلام ''صحیح ہے نا'' کی مٹھاس کانوں میں رس گھولتی محسوس ہو رہی ہے۔

میری نظر میں آپؒ کی شخصیت کا ایک انتہائی نمایاں پہلو آپؒ کا اخفائے حال تھا۔ آپؒ کے حین حیات آپؒ کے قریبی رفقاء واحباب تک کو آپؒ کی گونا گوں علمی ودینی ورفاہی مصروفیات کی مکمل واقفیت نہ تھی۔ آپؒ کی دن بھر کی مصروفیات سن کر جہاں حیرت اور تعجب کا جھٹکا لگا، وہیں آپؒ کی للّٰہیت اور خلوص نے دل میں آپؒ کی عظمت کو اور بڑھا دیا، دارالافتاء میں آپؒ کی جو مصروفیات تھیں، ان کا بوجھ اور ان کی ذمہ داری کما حقہ وہی جان سکتے ہیں جن کو اس راہ کے نشیب وفراز معلوم ہوں، ورنہ جن کا دارالافتاء سے صرف مسائل پوچھنے کی حد تک رابطہ ہو یا جن کا صرف دارالافتا سے گزر رہی ہوا ہو، وہ مسند افتا کی بھاری ذمہ داری کو کبھی نہیں سمجھ سکتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ جب ایسے ہی ناسمجھوں کی طرف سے کسی ناسمجھی کا اظہار بڑی دلیری کے ساتھ سننے میں آتا تو عقل ان کی جہالت وناواقفیت پر سراپا ماتم ہو جاتی ہے، جس کو کبھی سر میں درد ہی نہ ہوا ہو، سر درد سے کراہتا ہوا مریض اس کو اپنی تکلیف بتائے، تو کیسے؟ دارالافتا کی ان تھک ہمہ جہتی مصروفیات کے بعد تدریسی سلسلہ، وہ بھی صرف ایک جگہ بیٹھ کر نہیں، بلکہ تین مختلف جگہوں پر مختلف اوقات میں، اگر یہ خلوص کی علامت نہیں، تو پھر اس کو کیا کہا جائے؟

ایک مرتبہ آپؒ دوران گفتگو کوئی بات بتلانے لگے تو سلسلۂ کلام میں تذکرہ آیا ''میں ایک جگہ جمعہ

پڑھاتا ہوں''، پھر یک دم زور دے کر جملہ معترضہ کے طور پر کہا''لیکن یاد رکھو میں اس جمعہ پڑھانے کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا ہوں''اس وقت میرا خیال یہی تھا کہ کبھی کبھار کہیں کسی مسجد میں کسی کی جگہ جمعہ پڑھا لیا کرتے ہوں گے، کیوں کہ آپؒ باقاعدہ امام نہیں تھے، شہادت کے بعد اس سربستہ راز سے پردہ اٹھا کہ آپؒ نے اپنے رہائشی علاقے میں اہل محلّہ سے وفا کا یہ نمونہ وہاں ایک مسجد (مسجد نور) کی تعمیر کا انتظام سنبھالنے اور ایک دینی مدرسے (جامعۃ النور الاسلامیۃ) کی بنیاد دھرنے کی صورت میں پیش فرما رکھا تھا، اور جس مسجد میں جمعہ پڑھانے کی آپؒ بات فرمایا کرتے تھے، وہ یہی مسجد نور تھی، جس کے بانی ومبانی خود آنجناب کی ذات تھی۔ اس مدرسے میں سینکڑوں طلبہ نور نبوت سے اپنے سینوں کے چراغ روشن کر رہے ہیں، اور ان طلبہ میں ان بچوں کی بھی معتد بہ تعداد ہے، جن کے سروں سے ان کے والد کا سایہ اٹھ چکا ہے، اور حضرت شہیدؒ ان کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھ کر ان کے سروں پر موجود بالوں کی تعداد کے بقدر ہر گھڑی اجر وثواب کی روحانی لذت سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔

ملکی وبین الاقوامی کئی علمی ومذہبی وسیاسی شخصیات جامعہ میں وقتاً فوقتاً قدم رنجہ فرماتی رہتی ہیں، اور بعض اوقات مہمانوں کی قدر بلند کے پیش نظر جامعہ کے خارجی اطراف اور اندرونی در ودیوار میں غیر معمولی اثرات نظر آتے ہیں، لیکن آپؒ کو میں نے بارہا دیکھا کہ اس شور وشغب سے مکمل یکسو رہتے، اور آپؒ کے معمولات میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور نہ کچھ ہونے جا رہا ہے، اوروں کے لئے وہ دن بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی آپؒ کے لئے وہ دن بھی ایک معمولی دن ہی ہوتا اور اوروں کے جلو میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے سے آپؒ مکمل طور پر گریزاں رہتے، یہ بھی آپؒ کی اسی صفت اخفاء کا ایک اور مظہر تھا۔

اللہ تعالیٰ آپؒ کی اس صفت اخفا اور صفت خلوص سے مجھ سمیت آپؒ کے جملہ تلامذہ کو حصہ عطا فرمائے۔

پانچ سال کی عمر میں اپنے گاؤں کاروڑ سے کراچی کا سفر ہجرت کرنے والا، تقریباً تین دہائیاں طلب علم نبوت میں گزار کر، تبلیغ علم کا علم بلند کئے علم پھیلانے کا مخصوص مشن لئے، ۱۸/ربیع الاول ۱۴۳۴ھ بمطابق ۳۱/جنوری ۲۰۱۳ء کی دوپہر کو بھی معمول کے مطابق ایک محاذ سے دوسرے محاذ کی طرف اپنا فریضہ ادا کرنے ہی جا رہا تھا کہ پیغام اجل آ پہنچا، اور ہجرت کے بعد شہادت کے مرتبے سے بھی سرفراز ہوا۔ دارالافتا کا ایک دلچسپ عہد جس میں''چھوٹے'' کی آواز گونجتی تھی، قوم افغان کی قصیدہ خوانی ہوتی تھی، مختلف قوموں کے تاریخی ادوار اور ان کے ارتقاء کی دلنشین انداز میں تحلیل ہوتی تھی، ختم ہوا، اور شہید راہ علم مفتی صالح محمد کاروڑیؒ، ڈالمیا کے قبرستان کی خاک میں آسودہ خواب ہوئے، لیکن آپؒ کی یادوں کے دیے نہ جانے کتنے ہی دلوں میں جل رہے ہیں، جن کے باعث کتنی ہی آنکھوں سے ایک سیل رواں مسلسل جاری ہے:

جان کر من جملہ خاصۂ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے